چاول چور

راشن کی دکان پر دو طرح کے چاول تھے۔ چاول نمبر ایک، چاول نمبر دو۔ چاول نمبر ایک دیکھنے میں اچھے تھے دو نمبر چاول موٹے، بھدے اور بھورے تھے اور ان میں سے چمڑے کی سی بو آتی تھی۔

ترلوچن کی ماں کو اچھے چاول بہت پسند تھے۔ اس لیے وہ دستر خوان پر بھورے چاول دیکھ کر بہت بگڑی، بہو سے بولی۔

''یہ تم چاول پکاتی ہو یا چپل کا تلا کاٹ کر کھلاتی ہو۔ لے جاؤ ان چاولوں کو میرے سامنے سے۔''

اس پر بہو نے کچن کھسیا کر، کچھ گھبرا کر، کچھ لجا کر اپنے شوہر ترلوچن کی طرف دیکھا، پھر اپنی ساس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی، الجھے الجھے سانسوں میں بولی۔ ''تو ماں جی کیا کروں۔ جب راشن کی دکان پر جاتی ہوں، جب یہی دو نمبر چاول ملتے ہیں۔ جب نمبر ایک چاولوں کے لیے پوچھو۔ جب یہی کہتے ہیں کہ وہ چاول تو ختم ہو گئے یا اب کے نہیں آئے یا اگلی بار آئیں گے۔ وہ اگلی بار کب آتی ہے؟ کیا معلوم؟ اب میں کیا کروں؟ آپ کے لیے وہ بسی کی باسمتی کہاں لاؤں؟''

بسی کی باسمتی پر ترلوچن کی ماں چونک اُٹھی۔ گو بہو کا لہجہ نرم اور ریشم میں لپٹا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کے آخری نکیلے فقرے کی دھار نے ماں کے دل کو چوٹ پہنچائی کیونکہ ماں موضع بسی، کوہ مری کی رہنے والی تھی۔ جہاں اس کے شوہر جسونت سنگھ کی ایک چھوٹی سی زمینداری تھی۔ سردار جی کے انتقال کے دو برس بعد تک یہ زمینداری ماں کے قبضے میں رہی پھر ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بنا اور ماں کو فسادات کے دنوں میں بسی سے بھاگ کر بمبئی آنا پڑا۔ ماں کو اپنا گھر، اپنی زمینداری چھوڑنے کا اتنا غم نہ تھا جتنا اپنے چاولوں کو چھوڑنے کا رنج تھا کیونکہ اسے اچھے اچھے چاولوں کو اپنے کھیتوں میں بونے کا بہت شوق تھا۔ کتنے اصرار سے وہ اپنے خاوند سے کہہ سُن کر دُور دُور سے اچھے اچھے چاولوں کے بیج منگاتی تھی اور پھر پنیری کے سبزے سے دھان کے سنہرے خوشوں تک وہ اپنے چاولوں کی ہر منزل پر نگہبانی کرتی۔ اس انہماک، اس شدت، اس جذبے کے ساتھ اکثر خود اس کا خاوند جھلا کر اس سے کہتا۔ ''سردارنی چاول کھانے کے لیے یا بازار میں بیچنے کے لیے ہوتے ہیں، محبت کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔'' مگر سردارنی ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اسے چاولوں سے واقعی عشق تھا۔ اس لیے اس موقعے پر اپنی بہو کا ریشم میں لپٹا ہوا طعنہ برداشت نہ کر سکی، اس کی بوڑھی آنکھوں میں بہو مجھے باسمتی کا طعنہ دیتی ہے، تو یہی بتا تو بمبئی میں اتنے سال سے ہے تو ہے کبھی ہماری بسی کی باسمتی سے اچھے

چاول کھائے ہیں؟''

''نہیں ماں۔'' ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔

''اور بیگماں چاول بھی تجھے یاد ہوں گے۔ جب بیگماں کا دھان کھیتوں میں تیار ہو جاتا تھا تو کیسے سارا گاؤں اس کی خوشبو سے مہک اُٹھتا تھا بیگماں ایسے چاول سپنے میں نہیں ملیں گے۔''

ترلوچن نے پھر آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں ماں بیگماں چاول تو اب سچ مچ سپنوں کی طرح ہو گئے ہیں۔''

بیگماں چاولوں کے ساتھ خود ترلوچن کا بھی ایک شیریں سپنا بندھا ہوا تھا۔ ترلوچن نے آہستہ آہستہ یادوں کی پرانی رسی کو اُتارتے ہوئے اس سپنے کو کھولا تو اس میں سے راج کنور نکل آئی۔ لانبی، بانکی، حسین اور پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو۔ ''اچھا تو میں سمجھتی تھی تم نے مجھے بھلا دیا۔''

راج کنور ایک ہاتھ میں درانتی، دوسرے میں بیگماں چاول کے سنہرے خوشے لیے کھڑی تھی۔ وہ اس کے کھیتوں میں چاول چرانے آئی تھی۔

ترلوچن نے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو رات کے وقت ہمارے کھیتوں میں؟''

راج کنور چپ رہی۔

ترلوچن نے کہا۔ ''یہ چوری ہے۔''

راج کنور نے کہا۔ ''چوری نہیں مجبوری ہے۔''

ترلوچن نے کہا۔ ''کیوں؟ کیا تمہارا باپ لال سنگھ فصل سے اپنا حصہ نہیں لے جاتا!''

راج کنور نے غصے سے کہا۔ ''کتنا حصہ ملتا ہے؟ پہلے اس کی بات کرو۔ پھر یہ بتاؤ کہ بیگماں چاولوں میں سے ہمیں حصہ کیوں نہیں ملتا؟ ہمیں تو وہی موٹے، بھورے چاول ملتے ہیں۔ بیگماں چاول تو مالکوں کے لیے ہیں، مزارعوں کے لیے نہیں۔'' ترلوچن چپ ہو گیا۔

اور راج کنور نے سوچا وہ یہاں کیوں آئی۔ وہ یہاں نہ آتی تو اچھا ہوتا مگر وہ کرتی بھی کیا کیونکہ دن کو تو ایسا بُرا محسوس نہیں ہوتا لیکن رات کو جب ہوا کھیتوں سے بیگماں کی خوشبو اُڑا کر اسکے بستر پر لاتی تھی تو وہ بے چین ہو جاتی تھی، اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دھان کی ہزاروں بالیں سرسراتی ہوئی اس کے کانوں میں کچھ کہہ رہی ہیں، جیسے دھان کے لاکھوں دانے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف تکتے ہیں اور اسے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ ہر روز رات کو بیگماں چاول اسے اپنے پاس بلاتے تھے اور ہر روز وہ اپنے آپ کو روک لیتی تھی، مگر آج وہ نہ رُک سکی اور درانتی ہاتھ میں لیے زمیندار کے کھیتوں میں چلی آئی۔ آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں؟ وہ کھڑے ہو کر سوچنے لگی۔ میں نے انھیں بویا ہے، انھیں پانی، دھوپ، چمک اور گرمی دی ہے۔ میں ان کے لیے پہروں، گھنٹوں پانی میں کھڑی رہی ہوں، گھنٹوں دھوپ میں جلا کی ہوں، میں نے انھیں بچوں کی طرح پالا ہے۔ آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں؟''

راج کنور نے دھان کی بالیوں کے اپنے رخسار سے لگالیا اور ترلوچن سے کہنے لگی۔ ''ہائے کتنے اچھے ہیں یہ چاول

ایک ایک دانہ عطر میں بسا ہوا، اب تم چاہو تو مجھے سردار جی کے سامنے لے چلو یا پولیس کر دے دو۔ مگر میں تو آج فیصلہ کر کے آئی تھی کہ تمہارے کھیتوں سے بیگماں چاول لے کے جاؤں گی۔"

ترلوچن نے راج کنور کے ساتھ سے درانتی چھین لی اور کھیت میں بیٹھ کر بیگماں کے اتنے پودے کاٹ ڈالے کہ راج کنور کی دونوں باہیں دھان کے خوشوں سے بھر گئیں۔ راج کنور کے رخسار خوشی سے تمتما اُٹھے۔ اس نے دھان کے خوشوں کے درمیان سے ترلوچن دیکھا اور بولی۔ "تم کالج میں پڑھتے ہو، درانتی چلانا وہاں سکھاتے ہیں کیا؟"

ترلوچن نے کہا۔ "کسان کا بیٹا ہوں۔"

راج کنور نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دھان کے خوشوں کو دیکھا جنھیں وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ اس نے عجیب نگاہوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔

راج کنور کے جانے کے بعد ترلوچن کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ رات ہے اور رات کا سناٹا ہے، آسمان پر چاند ہے اور چاند کے گرد ہالہ ہے، سامنے خوبانی کا درخت ہے اور خوبانی کے درخت پر بلبل بول رہی ہے، چاروں طرف خوشبوؤں سے لدے دھان کے کھیت ہیں اور کھیتوں کے کنارے کنارے بسی ندی ہولے ہولے بہہ رہی ہے۔

مگر یہ سب کچھ اس نے راج کنور کے جانے کے بعد محسوس کیا۔

اب اس رات اتنا کچھ یاد کرنے کے بعد ترلوچن نے ایک بار سر ہلا کے کہا: "ہاں ماں تم سچ کہتی ہو، بیگماں چاول بہت ہی شیریں اور لذیذ ہوتے ہیں۔"

"اور تجھے یاد ہے۔" ماں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"جب سردار جی ایک دفعہ سری نگر سے زعفرانی چاولوں کا بیج لے کے آئے تھے۔ یاد ہے کتنی محبت سے ہمارے مزارعوں نے وہ زعفرانی دھان ہمارے کھیتوں میں تیار کیا تھا۔ لوگ کہتے تھے زعفرانی چاول کوہ مری میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر پیدا ہو گا بھی تو اس کی خوشبو مر جائے گی۔ لیکن جب دھان کھیتوں میں لہلہانے لگا تو دوسرے گاؤں تک زعفران کی خوشبو گئی تھی۔ ہمارے گاؤں والے خوشی سے پاگل ہو گئے تھے۔ یاد ہے جب وہ دھان پن چکی سے صاف ہو کے آیا تھا ہائے! کیسے بانکے، تیکھے اور پتلے پتلے چاول اس میں سے نکلے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مہین باریک چاول۔ لیکن جب ہانڈی میں ڈالو تو کیسے پھیل کر لمبے ہو جاتے تھے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ پور کے لمبے چاول۔ یاد ہے ترلوچن؟"

ترلوچن کو اچھی طرح یاد تھا کیونکہ جس دن زعفرانی چاولوں کی فصل کٹی تھی اس دن اس کے باپ سردار جسونت سنگھ نے اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا کیونکہ ترلوچن نے مزارعوں کو زعفرانی چاول کی فصل میں سے حصہ مانگنے پر اُکسایا تھا۔ گاؤں میں صرف دو زمیندار تھے...... سردار کلونت سنگھ اور جسونت سنگھ۔ موضع بسی کی ساری زمین ان دونوں سرداروں کے پاس تھی۔ ترلوچن کا گناہ اگر صرف اتنا ہوتا کہ وہ صرف کلونت سنگھ کے مزارعوں کو حصہ مانگنے پر اُکساتا تو خیر کوئی بات نہ تھی، جسونت سنگھ اسے معاف کر دیتا، مگر یہاں تو اس لونڈے نے خود اپنے باپ کے گھر میں

بیٹھ کر اسکی زمیندار کو اُلٹنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ تو خود کسان لوگ ڈر کے مارے نہیں مانے۔ جو جھنجھوڑے سے تیار بھی ہوئے انھیں جھٹ زمیندار نے بے دخل کر دیا، اس سے وہ لوگ اور بھی ترلوچن کے خلاف ہو گئے۔ پھر جب ان زعفرانی چاولوں کی فصل کاٹنے کا زمانہ آیا تو ترلوچن نے ملک پینداخان اور ملک لال خاں اور دوسرے مزارعوں کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ وہ زعفرانی چاولوں میں سے اپنا حصہ مانگیں۔

سردار جسونت سنگھ نے گرج کر کہا۔ ''نہیں ملکا نہیں لال خاں یہ نہیں ہوگا۔ تم لوگوں کو وہی چاول ملیں گے جو تم ہمیشہ لیتے آئے ہو۔'' ملک لال خان بولا۔ ''وہی لال، موٹے، اجڑ چاول؟''

''ہاں، ہاں وہی موٹے اُجڑ چاول جو تم ہمیشہ کھاتے ہو۔''

کھیتوں میں جہاں یہ بات ہو رہی تھی، زعفرانی دھان کی سنہری بالیاں جگہ جگہ پڑی تھیں، ملک پینداخان ان کی طرف حسرت سے دیکھ کے کہنے لگا۔ ''سردار جی ہم نے ان پر بڑی محنت کی ہے، اپنے بچوں سے زیادہ محبت سے ان چاولوں کو پالا ہے، آخر ان پر ہمارا بھی کچھ حق ہے، کچھ تو انصاف کرو۔''

اس پر ترلوچن سے نہ رہا گیا، اس نے باپ سے اجازت لیے بغیر وہیں سب کے سامنے مزارعوں میں زعفرانی دھان کے پودے تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ اس پر اس کے باپ کو سخت غصہ آ گیا۔ وہ گھر سے بندوق اُٹھا لایا اور قریب تھا کہ اپنے بیٹے کو گولی کا نشانہ بنا دے کہ ترلوچن کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور دوسرے مزارعے بھی بیچ میں آ گئے۔ بڑی مشکل سے ترلوچن کی گلو خلاصی ہوئی مگر اسے گھر سے نکال دیا گیا اور مزارعوں کو چاول کا ایک دانہ نہ ملا۔

ترلوچن نے وہ رات پینداخاں کے گھر بسر کی، صبح اُٹھ کر وہ راج کنور کے گھر کی طرف چلا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ ایک نظر راج کنور کو دیکھ لے مگر راج کنور اپنے گھر پر موجود نہ تھی۔ پتا چلا کہ وہ گوردوارے گئی ہے۔ ترلوچن گوردوارے پہنچا لیکن دہلیز پر رُک گیا اور دہلیز کے باہر پڑے ہوئے جوتوں میں سے راج کنور کا جوتا تلاش کرنے لگا۔

گوردوارے کی دہلیز کے باہر بہت سے جوتے پڑے ہوئے تھے۔ اچھے جوتے، بُرے جوتے، نئے جوتے، پُرانے جوتے، بڑے جوتے، ترلوچن ان میں سے بہت سے جوتوں کو پہچانتا تھا کیونکہ انسان کے ہاتھ اور پاؤں جس چیز کو چھوتے ہیں اس میں اپنے کردار کا رخانہ کہ، اپنے سماج کی تصویر، اپنے ماحول کی تفریق اس کا تضاد اور کشمکش بھر دیتے ہیں۔ جوتوں سے آدمی کسی کے بچپن کو مسکراتے ہوئے دیکھ سکتا ہے، کسی کی جوانی کا گیت سُن سکتا ہے، کسی کے بڑھاپے کی جھریاں گن سکتا ہے۔ جوتے نہ صرف انسان عمر بتاتے ہیں اور جنس بتاتے ہیں بلکہ اس کے طبقے کا نام بھی بتاتے ہیں اور پبلک سیفٹی آرڈی نینس کے باوجود بتاتے ہیں کیونکہ بعض انسانوں کو تو جیل میں اور پھانسی کا ڈر دلا کر جماعتی تفریق اور طبقاتی جنگ کی سچائی کے اظہار سے روکا جا سکتا ہے لیکن جوتوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے معمولی کسان ہیں، یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے ان سے اونچے کسان ہیں، یہ پمپ شو سردار جسونت سنگھ کا ہے، یہ کریپ کا جوتا سردار کلونت سنگھ کا ہے۔ یہ سیاہ بوٹ تھانیدار حکم سنگھ کا ہے۔ یہ

پشاوری طلائی چپل خوش حال چند پٹواری کی ہے۔ یہ جوتے باقی جوتوں میں الگ الگ اور خوش حال نظر آتے ہیں، جیسے یہ دونوں زمیندار اور تھانیدار اور پٹواری گاؤں کے مزارعوں سے الگ نظر آتے ہیں۔ جوتے نہ صرف سماج کا تضاد بتاتے ہیں بلکہ حکومت کا رعب بھی بتاتے اور زمیندار کی دولت بتاتے ہیں۔ جوتے کبھی کبھی اخبار کا کام بھی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ گرگابی جیت کور کی ہے جس کا خاوند پچھلے ماہ فوج سے آیا ہے اور اس کے لیے یہ نئی گرگابی لایا ہے۔ یہ نیا جوتا ہرنام سنگھ کا ہے جس نے بیسے سے قرض لے کر اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور اس خوشی میں یہ نیا جوتا بنوایا ہے۔ یہ ایک بیساکھی اور ایک فوجی جوتا رام سنگھ کا ہے جو جنگ میں دونوں ٹانگیں لے کر گیا تھا اور ایک ٹانگ لے کر واپس آیا ہے۔ یہ نیا جوتا کس کا ہے؟ ہمارے گاؤں میں اس طرح کے جوتے نہیں پہنے جاتے ضرور کوئی اجنبی ہمارے گاؤں میں آیا ہے۔ ترلوچن نے سوچا۔ پھر اس کی نگاہ راج کنور کے سلیپر پر پڑی اور اس کی نگاہوں میں خوشی چمک اُٹھی۔ تو راج کنور بھی واقعی گوردوارے کے اندر ہے۔

ترلوچن گوردوارے کے باہر کھڑا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ وہ گوردوارے کے اندر جائے کہ نہ جائے، اندر اس کا باپ تھا اور راج کنور بھی تھی۔ کبھی وہ اپنے باپ کے جوتوں کی طرف دیکھتا اور کبھی راج کنور کے سلیپر کی طرف۔ گاؤں میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ زمیندار نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا ہے۔ جب وہ گوردوارے کے اندر جائے گا تو لوگ اس کی طرف دیکھیں گے!! اس خیال سے بھی وہ رُک گیا۔ یکایک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دہلیز کے باہر سارے جوتے منہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: "یہ زمیندار کا بیٹا ہے جسے ایک باپ نے اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ ان کے طنزیہ نگاہوں کی تاب نہ لاسکا اور فوراً گوردوارے سے مڑکر واپس چلا گیا۔ جاتے وقت اس بڑی حسرت سے ایک آخری نگاہ راج کنور کے سلیپر پر ڈالی اور پھر وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔ ترلوچن خاموشی سے اپنے گاؤں سے رُخصت ہوگیا اور پھر کبھی واپس نہیں گیا۔ گارڈن کالج راولپنڈی میں اس کا پڑھنا ناممکن ہوگیا اس لیے وہ لاہور چلا آیا۔ اسے مصوری کا شوق تھا، یہاں پر وہ سردار گوپال سنگھ، کمرشل آرٹسٹ کے سٹوڈیو میں ملازم ہوگیا اور کام سیکھتا رہا۔ پھر لاہور سے وہ بمبئی چلا آیا۔ کیونکہ بمبئی میں ای اچھے کمرشل آرٹسٹ کے میدان زیادہ وسیع تھا۔ یہاں آ کے تھوڑے ہی دنوں میں اس کا کام اتنا پسند کیا گیا کہ وہ اپنا سٹوڈیو کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب آٹھ سال سے وہ بمبئی میں مقیم تھا۔ یہیں اس نے ایک مراٹھی لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ مالا، جو اس کی ماں کی بہو تھی۔ اب اس کے چار بچے بھی تھے۔ اب وہ قریب قریب اپنے اپنے گاؤں کو بھول سا گیا تھا لیکن راج کنور کے سلیپر اُبھر آتے اور وہ سوچتا۔ جانے وہ چھوٹے چھوٹے سلیپر آج کہاں ہیں؟ جانے کس دہلیز کے کنارے کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ آج وہ خود دوسرا تھا، اس کی دہلیز دوسری تھی۔ وہاں پر کوئی اور ہی سلیپر پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس سے کیا ہوتا ہے۔ زخم تو بھر جاتا ہے لیکن زخم کی یاد تو نہیں بھرتی۔

اس لیے جب ماں نے اپنے زعفرانی چاولوں کے بارے میں پوچھا تو بیٹا سر ہلا کے چپ ہوگیا۔ اس نے دو ایک لمحوں کے لیے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ کتنے رعجب کی بات ہے ماں کو زعفرانی چاول تو یاد ہیں لیکن میرا گھر سے

نکالا جانا یاد نہیں۔ مگر وہ اپنی ماں کی کمزوری اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے اس وقت چپ ہو رہا۔ ماں نے ہولے ہولے سر ہلایا اور اپنی بہو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "مالا تو میراٹھی لڑکی ہے تو ہمارے گاؤں کے چاولوں کی خوشبو کیا جانے۔ تو نے کبھی ہماری بسی کی باسمتی کھائی ہوتی تو میں تجھ سے بات کرتی۔"

مالا نے جل کر کہا۔ "ہاں ماں جی ہم نے تمہارا گاؤں دیکھا نہ تمہارے گھر کے چاول کھائے، اب ہم کیا جانیں کوئی سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔" ماں نے کہا۔ "اچھا تو میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے؟ ہاں ہاں ٹھیک ہے میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے کیونکہ تو گھر والی ہے اور میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" ماں نے آبدیدہ ہو کے کہنا شروع کیا۔ "اب میرے کھیت نہیں ہیں۔ بجلی پڑے چاول چوروں پر جنھوں نے میرے چاول مجھ سے چھین لیے ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس "ایگوے تگڑے" کرنے والی لڑکی کے گھر آتی۔"

مالا نے انگلیاں نچا کر کہا۔ "وہ! میرے "ایگوے تگڑے" پر حرف رکھتی ہو اور اپنے "ایتھے وتھے" کو بھل جاتی ہو۔ یہ "ایتھے وتھے" کیا بلا ہے؟ پنجابی تو بالکل جنگلیوں کی زبان ہے۔"

ماں نے چلا کر کہا۔ "اور تیری میراٹھی زبان کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منہ میں پتھر ڈال کے بول رہے ہوں۔"

"پتھر پڑیں تیرے منہ میں۔"

"تیرے منہ میں۔"

مالا اور سردارنی دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور قریب تھا کہ گتھم گتھا ہو جائیں کہ ترلوچن بیچ میں آ گیا اور ماں اور بہو دونوں کو ڈانٹنے لگا اپنی ماں اور دادی کو روتے دیکھ کر اور اپنے باپ کو اونچا بولتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے اور سب سے چھوٹی بیٹی راج کنور تو بالکل ڈر گئی (ترلوچن نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام راج کنور رکھا تھا۔ محبت کیسے ایک سطح سے دوسری سطح پر آ جاتی ہے محبوب کی چاہت کیسے بیٹی کی اُلفت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مشاہدہ ہے) ترلوچن نے راج کنور کو اپنی گود میں اُٹھا کر پچکارا، دلاسا دیا، بڑے بچے کو دادی نے سنبھالا اور دونوں منجھلے مالا کی ساڑھی پکڑ کر رونے لگے۔ مالا انھیں پیار کرنے لگی اور ساس بہو دونوں اپنی لڑائی بھول گئیں۔

ترلوچن نے کہا۔ "آج نمائش میں جانا تھا، آج سٹوڈیو بند کیا، دوسرے سارے پروگرام ختم کر دیئے، بچوں کو تیار کیا، اب دونوں یہ فساد لے کر بیٹھ گئی ہو۔ مالا کیا تم سے بھی چپ نہیں بیٹھا جاتا؟ ماں جی تو مزاج کی تیز ہیں، کیا تم ان کی خاطر اپنی زبان تھوڑی دیر کے لیے دانتوں تلے نہیں داب سکتیں؟"

"اچھا تو لو۔" مالا نے سچ مچ اپنی چھوٹی سی سرخ زبان کو دانتوں تلے دبا کے دکھایا۔ اس کی یہ ادا ترلوچن کو بہت پسند آئی۔ ترلوچن مسکرا دیا۔ ماں بھی مسکرا پڑی۔ مالا گو مراٹھی لڑکی تھی۔

اور اس لیے غیر قوم کی تھی۔ مگر بڑی حسین تھی۔ آج جب اس نے زبان دنتوں تلے داب کر دکھائی تو سردارنی کو وہ ایک معصوم بچی کی طرح معصوم خوبصورت اور پیاری معلوم ہوئی۔ ماں اس کی ادا کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ہنس

پڑیں۔ساس کو ہنستے دیکھ کر مالا کا اندر زبھی بدل گیا،اس نے جھٹ آ کے ماں کے پاؤں چھولیے اور ماں نے اسے فوراً گلے سے لگالیا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں:

''واہگورو تیرا سہاگ سدا قائم رکھے! تو تو میری ایک ہی بہو ہے، مجھ نہ لڑا کر۔''

''میں کہاں لڑتی ہوں۔'' مالا اپنے آپ کو ماں کی آغوش میں چھپاتے ہوئے بولی۔

ترلوچن نے کہا۔''اچھا تو ماں جی اب جلدی سے کھانا کھالو۔نمائش میں دیر ہو رہی ہے۔''

ماں نے کہا۔''نہیں ترلوچن میں نمائش دیکھنے نہیں جاؤں گی۔''

ترلوچن نے کہا۔''بڑی اچھی نمائش ہے،روس،چین چیکوسلواکیا،پولینڈ،ہنگری اور دوسرے ملکوں کا،جہاں لوگوں نے نئی زندگی کی ہے،سب کا حال اس نمائش سے معلوم ہو جاتا ہے۔''

ماں نے پوچھا:''نئی زندگی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

ترلوچن نے کہا:''میرا مطلب یہ ہے کہ جن جگہوں پر لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد کس طرح اتنی اچھی زندگی بنائی ہے۔نمائش میں اس کا پتا چلتا ہے مثال کے طور پر چین کو لے لو۔روس تو خیر بہت ترقی یافتہ ملک ہے ،مگر چین ہی کو دیکھ لو،مشکل سے دو برس گزر رہے ہیں ا آزادی حاصل کیے ہوئے مگر آج ان کی نمائش دیکھو تو معلوم ہوتا ہے یہ چین کے لوگ دو سال میں کہاں سے کہاں آگے نکل گئے ہیں۔''

ماں نے انکار میں سر ہلا کے کہا:''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم لوگ چار سالوں کی آزادی میں کچھ نہیں کر سکے،اب تک وہی بھورے اجڑ چاول کھا رہے ہیں،چین لوگ کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا ان کے چار ہاتھ ہیں یا چار پاؤں ہیں؟ کیا بات کرتے ہو تم بھی؟''

''نہیں ماں'' ترلوچن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔''چین کے لوگوں کا کام کرنے کا طریقہ ہم سے الگ ہے۔وہاں پر سچ مچ لوگوں نے راج کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔انھوں نے زمینداری کو ختم کر کے ساری زمین کسانوں میں بانٹ دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں اب سارے کسان سفید چاول کھاتے ہیں۔''

''تو پھر تو سیدھی طرح کیوں نہیں کہتا کہ چین والے بھی چاول چور ہیں۔ہمارے چاول چھین کر خود کھاتے ہیں۔بھلا میں ایسے چاول چوروں کی نمائش میں کیوں جانے لگی۔''

ترلوچن نے کہا:''ماں چین اور پاکستان اور ہندوستان کی بات ایک نہیں ہے۔پاکستان میں تیری زمینداری ملک خاں اور پینداخاں میں نہیں بٹی۔اسے تو جالندھر کے پٹھان شہباز خان کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔صرف زمیندار کا نام بدلا۔زمینداری نہیں بدلی ہے۔بے شک گوردوارے کا پاٹھ ختم ہوا لیکن مسجد کی جوتیوں کا تضاد بدستور قائم ہے اور زعفرانی چاول والے اسی طرح بھورے چاول والوں پر حکومت کرتے ہیں کیونکہ جو یہاں ہندوستان میں نواب تھے وہاں جا کے بھی نواب رہے اور جو پاکستان راجا تھے ہندوستان آ کے بھی راجا رہے لیکن چین میں لوگوں نے ہماری طرح دھوکا نہیں کھایا،انھوں نے نوابی اور زمینداری کو ایک سرے سے ختم کر دیا ہے۔''

ماں نے مسکرا کے کہا۔ ''ترلوچن تو شروع ہی سے چاول چوروں کا دوست رہا ہے اس لیے تو ان کی حمایت کرتا ہے ،اسی لیے باپ نے تجھے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ تیری باتیں وہی ہیں۔''

ترلوچن نے کہا: ''ماں اب تو چلے گی یا بے کار بحث کرتی جائے گی۔

''چلوں گی کیوں نہیں! اب گھر کے سب لوگ جا رہے ہیں تو اکیلی یہاں بیٹھ کے کیا کروں گی۔''

مالا نے کہا: ''ہماری ہمسائی پشپا ناگ رتنا بھی چل رہی ہے۔ اسے بھی ساتھ لے لیں۔''

نمائش میں پہنچ کر پشپا ناگ رتنا اور اس کے خاوند روسی نمائش گھر دیکھنے چلے گئے۔ روسی نمائش گھر سب سے اونچا ،پرشکوہ اور عمدہ تھا اور مالا کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے روسی نمائش گھر کو دیکھا جائے مگر ماں سب سے پہلے چینی نمائش گھر دیکھنے پر مصر تھیں۔ کہنے لگیں: ''میں بھی تو دیکھوں ان چینی لوگوں نے کیسے دو ہی سال میں اتنی ترقی کر لی ہے، مجھے بالکل یقین نہیں آتا اس لیے سب سے پہلے میں چینی گھر دیکھوں گی۔''

ترلوچن اپنی ماں، بیوی اور بچوں کے لے کر چینی گھر میں داخل ہوا آہستہ آہستہ ہر سیکشن سے گزرتے ہوئے اپنی ماں کو ہر بات سمجھائے جاتا تھا۔

''دیکھو ماں یہ چین کا کوئلہ ہے، یہ کچا کوئلہ ہے، یہ دونوں مانچوریا کی کانوں سے نکالے جاتے ہیں۔ مانچوریا چین میں ہے، چین میں لوہے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔''

ماں نے کہا: ''مگر ہمارے ملک ہندوستان بھی لوہے، کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔''

ترلوچن نے کہا: ''دیکھو یہ چین کے برتن کتنے خوبصورت ہیں۔''

''ماں نے کہا: ''مگر ہمارے مراد آباد کے برتن ان سے کم خوبصورت نہیں ہوتے۔''

ترلوچن نے کہا: ''یہ چینی کپڑے، ریشم کے کپڑے سُوت کے کپڑے، یہ دیکھو چینی بروکیڈ۔''

ماں نے کہا: ''مگر ہمارے یہاں بھی ریشمی، سوتی ہر طرح کا کپڑا اتیار رہتا ہے، بروکیڈ ہمارے ہاں ہوتی ہے اور بنارس کی ساڑھی کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے۔''

ترلوچن نے کہا: ''دیکھو دھان اور گیہوں کے خوشوں کا بنا ہوا سامان، خوبصورت پتلی چٹائیاں، ٹوپیاں، بکس ،جوتے۔''

ماں نے کہا: ''مگر یہ کیا نئی بات ہوئی۔ ہمارے بسی گاؤں کی کسان عورتیں بالکل ایسا سامان بناتی ہیں۔''

''یہ کاغذ کا سامان دیکھو، یہ ٹیبل لیمپ۔''

''مگر کشمیر کی پیپر ماشی اس سے عمدہ ہوتی ہے۔ یقین نہ ہو تو سری نگر میں جاکے دیکھ لو، میں ایک دفعہ سردار جی کے ساتھ سری نگر جا کے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ چکی ہوں۔''

''یہ چمڑے کا سامان۔''

''مگر......''

"فونٹین پین۔"

"مگر......"

"مشینری......"

"مگر......"

"گلوانو میٹر۔"

"مگر......"

ترلوچن ہر چیز اُٹھاتا گیا اور ماں بڑے مزے سے "مگر" کہہ کے رد کرتی گئی۔ وہ ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے بیچ بیچ میں اپنے ہونٹ خمیدہ کر کے کہتی گئیں: "مگر ہمارے ملک میں تو یہ چیز اس سے بھی عمدہ تیار ہوتی ہے۔"

ترلوچن کا غصہ اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا تھا۔ عجیب عورت ہے اسے کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ مگر وہ ماں سے نمائش گھر میں کیسے لڑ سکتا تھا۔ اس لیے زہر کا گھونٹ پی کر چپ ہو رہا ہے۔ اب اس نے بددل ہو کر ماں کو چیزیں دکھانا چھوڑ دیا اور چپ چاپ اپنے خاندان کے ساتھ چلنے لگا حتیٰ کہ یہ لوگ چینی گھر کے آخری حصے میں آن پہنچے۔ ترلوچن بڑی بے دلی سے اپنی ماں کے ساتھ چل رہا تھا کہ یکایک اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک چیخ نکلی اور دونوں ہاتھ پھیلائے آگے آگے دوڑی گئی۔

مالا نے گھبرا کر اپنی ساس کی طرف دیکھا کہ کیا ماجرا ہے اور پھر دوسرے ہی لمحے خود اس کے منہ سے بھی خوشی کی ایک چیخ نکل گئی اور وہ بھی اپنے خاوند اور بچے چھوڑ کر اپنی ساس کے پیچھے پیچھے بھاگی بھاگی گئی۔

سامنے ہزاروں من مکئی، ہزاروں من گیہوں اور ہزاروں من چاول کے بڑے بڑے انبار لگے تھے۔ اتنے بڑے بڑے انبار مالا نے خیر کبھی نہیں دیکھے تھے کیونکہ وہ بمبئی کی چالیوں میں پلی تھی لیکن ماں نے بھی جس کی اپنی مینداری رہ چکی تھی، اس نے بھی اپنی زندگی میں اتنا اناج کبھی ایک جگہ اکٹھا نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے خوشی سے اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک چاول کے چمکتے ہوئے انبار میں ڈال دیئے۔ ہاں، وہی مہین، باریک پتلے بانکے چاول ہیں! ماں کو یقین نہیں آیا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیوں میں ان چاولوں کو بھر بھر کر اوپر اُچھالتی جیسے کوئی ماں انتہائی خوشی کے عالم میں اپنے بچے کو ہوا میں اُچھالتی ہے اور پھر نیچے آتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں دبوچ لیتی ہے۔ ماں آج چینی چاولوں سے اس طرح پیار کر رہی تھی کیونکہ آج اپنے کھیتوں میں واپس آ ئی تھی، آج اس کے سامنے دھان کے خوشے تھے، آج گاؤں میں فصل کٹ رہی تھی، عورتیں نئی زندگی کے گیت گا رہی تھیں۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیونکہ آج اسے اپنے چاول مل گئے تھے۔

ترلوچن نے دیکھا صرف ایک ماں ہی ان غلے کے انباروں کے سامنے موجود نہیں ہے بلکہ بمبئی کی سیکڑوں مائیں اور بہوئیں اپنے دلوں کی تشنہ کامی لیے وہاں کھڑی ہیں۔ ان کے سینے متضاد جذبات سے متلاطم تھے، راشن کی دکان کے سامنے تیز جلتی ہوئی دھوپ میں لمبی قطاریں، تھکے ہوئے مضمحل اور اداس قدم دھیرے دھیرے کچھوؤں کی طرح اناج

کی طرف بڑھتے ہوئے، بھورے بھورے، پیلے راشن کارڈ جن پر ان کے نام مجرموں کی طرح لکھے ہوئے اور آخر میں اس لمبی قطار کی بعد ایک یونٹ چاول یا دو یونٹ چاول یا دو یونٹ گیہوں اور جب وہ اس مٹھی بھر اناج کو جھولی میں اُٹھا لیتیں تو سوچنے لگ جاتیں یہ ہفتے بھر کا راشن ہفتے میں کتنے دن چلے گا! اس مٹھی بھر اناج سے وہ کس کس کی بھوک مٹائیں گی! اپنے بچوں کی، اپنے خاوند کی یا بوڑھے باپ کی، راشن دینے والے کیا یہ نہیں جانتے کہ بچوں کو بہت بھوک لگتی ہے؟ وہ دن میں ایک یا دو دفعہ نہیں دس دفعہ کھانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ہاتھ پھیلنا چاہتے ہیں اور پاؤں بڑھنا چاہتے ہیں اور آنکھیں روشن ہونا چاہتی ہیں اور کلیاں پھول بننا چاہتی ہیں۔ لیکن راشن کی دکان پر صرف منجمد یونٹ ملتے ہیں۔ پھولوں کی شبنم اور صبح کا نور نہیں ملتا۔ وہاں خوراک نہیں ملتی تھوڑی تھوڑی بھوک ملتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی موت ملتی ہے...... ایک یونٹ یا دو یونٹ ان عورتوں کا سینہ ان تلخ یادوں سے گھٹا ہوتھا۔ یکا یک ترلوچن نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت نے بے اختیار ہو کر اپنے رخسار گیہوں کے انبار سے لگا دیئے اور اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس کے چہرے پر بچوں ایسی نورانی طمانیت آ گئی جیسے اس نے اپنی ساری زندگی کے راشن کارڈ پھاڑ ڈالے ہوں اور جست لگا کر اس زندگی میں پہنچ گئی ہو جہاں انسان کی محنت گیہوں کی سنہری فراوانی پیدا کرتی ہے اور مکئی کی شہد آگئیں شیرینی کو ہرتے ہوئے ہونٹ پر پھیلا دیتی ہے۔ ترلوچن نے بڑی مسرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اپنے بچوں کو دوسرے بچوں کے ساتھ اناج کے انباروں کے گرد ناچتا دیکھ رہی تھی۔ اس وقت سبھی عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے ایک ہی سرخوشی سے سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ ترلوچن نے دیکھا اس وقت ان کے چہرے پر وہ سارے سپنے اُبھر آئے ہیں جنھیں انھوں نے آج تک ناممکن سمجھ کر اپنے زندانی سینے کے تاریک گوشے میں قید کر رکھا تھا۔ اس وقت ان سب لوگوں کی نگاہیں بے اختیار نئے چین کو سلام کر رہی تھیں، ان نئی زندگی کو، اس نئی محنت کو سلام کر رہی تھیں جس نے اپنی متحدہ کاوش سے نئی زندگی کے انبار لگا کر ان کے سامنے رکھ دیئے تھے اور دُور دُور کھڑے ہوئے نمائش گھر کے چینی کارکن بھی مسکرا دیئے تھے گویا زبان حال سے کہہ رہے تھے: ''جو کچھ ہم نے کیا ہے تم بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کے سپنے بھی سچے ہو سکتے ہیں لیکن یہ سپنے صرف دیکھنے سے سچے نہیں ہوتے۔ پہلے ان میں ہل چلانا پڑتا ہے، پھر ان میں اپنا خون بونا پڑتا ہے پھر کہیں جا کر سپنوں کی پہلی فصل سچی ہوتی ہے۔

رات کے نو بجے وہ لوگ اپنے گھر پہنچے۔ راستے میں ماں بالکل خاموش رہی۔ ترلوچن نے بھی اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف کبھی کبھی کنکھیوں سے اپنی ماں کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پاتا۔ گھر پہنچ کر مالا نے کوار کھلے، بتی روشن کی اور بچوں کی طرح ساس سے پوچھنے لگی۔

''بچے بھوکے ہیں۔ اس وقت کیا پکاؤں جو جلدی سے تیار ہو جائے؟''

ماں نے کہا۔ ''وہی بھورے چاول پکا لو، جلدی تیار ہو جائیں گے۔''

مالا نے پوچھا۔ ''آپ بھورے چاول کھائیں گی، خفا تو نہ ہوں گی؟''

''نہیں۔'' ماں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

مالا مسکرانے لگی، بولی: ''ماں جی اگر میں آپ کو آج سفید چاول کھلاؤں تو مجھے کیا انعام دیں گی؟''

یہ کہہ کر مالا نے پرس کھولا اور اسے تپائی پر اُلٹا دیا۔ چینی چاولوں کے دانے تپائی پر بکھر گئے۔ ایک مٹھی چاول۔

ترلوچن حیرت سے مالا کی طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں بڑا بیٹا آگے آیا، اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور دو مٹھی چاول نکال کر تپائی پر رکھ دیئے۔ پھر منجھلا بیٹا ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور اسے بعد چھوٹا منجھلا بیٹا، دونوں کی جیبوں میں سے وہی چاول نکلے، تپائی پر سفید چاولوں کی ایک ڈھیری سی بن گئی۔ پھر چھوٹی لڑکی راج کنور نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنی فراک کی ننھی سی جیب کو ٹٹولا اور اس میں سے سفید چاول نکال کر اپنی ننھی مٹھی بھری اور ماں جی کو دکھا کر بولی: ''میں بھی تانوں آئی ہوں دیکھو ماں، میں تانول آئی ہوں''

اب سب بچوں کی نظریں مالا اور ترلوچن کی نگاہیں ماں پر تھیں۔ ماں ان نگاہوں کا بوجھ نہ سہا سکیں، ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا، پھر ان کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ پھر انھوں نے اپنی انگلیوں کو بے چین پا کر انھیں دوپٹے کے پلو کو ٹٹولنے دیا اور خود بخود پلو کے کونے سے ایک مٹھی چاول سرک کر تپائی پر آگرے۔

ترلوچن نے مسکرا کے کہا: ''ماں تم بھی! چاول چور!''

ماں سر جھکا کر خاموش ہوگئی۔ بہت دیر خاموش رہی، پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اُٹھا کر اپنے بیٹے سے کہا: ''آج مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم لوگ چاول چور نہیں ہو، تم چاول پیدا کرنے والے ہو، اور تھوڑے چاولوں کو بہت سے چاولوں میں اور بھورے چاولوں کو سفید چاولوں میں تبدیل کرنے والے ہو اور اگر اس پر بھی دنیا تمہیں چاول چور کہتی ہے تو کہے، میں آج سے تمہارے ساتھ ہوں، واہگورو! تمہیں فتح دے۔'' یہ کہہ کر ماں نے ترلوچن کو گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔ ترلوچن کا چہرہ کھل اُٹھا، مالا خوشی سے مسکرانے لگی۔ بچے سفید چاولوں کو تپائی پر دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور چیخ رہے تھے اور تپائی بجا رہے تھے۔ یہ شور سُن کر مالا کی ہمسائی پشپا نگ رتنا بھی اندر آئی: ''کیا ماجرا ہے؟ آج کس بات کی خوشی ہے؟'' مالا نے کہا: ''آج ہمارے گھر ایک چینی مہمان آیا ہے۔'' مالا نے یہ کہہ کر تپائی پر پڑے سفید چاولوں کی طرف اشارہ کیا۔ ناگ رتنا نے ان چاولوں کی طرف دیکھا، پھر مالا کی طرف دیکھا اور مسکرا کے بولی۔ ''آج یہ مہمان ہمارے گھر بھی آیا ہے۔''

......☆......